۲۲ جون ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار
ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۴

اس شمارے میں

اداریہ

اردو میں درسی کتابوں کا مسئلہ

(۱)

اردو میں جو درسی کتابیں ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک تو اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کے لئے، دوسرے اردو میں اسکولوں کے تمام مضامین پڑھانے کے لئے دونوں کا مسئلہ مختلف ہے۔ اردو ایک مضمون کی حیثیت سے ابتدائی اور ثانوی اسکولوں سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی منزل تک پڑھائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی منزل پر درس کے مقاصد اور ہیں، ثانوی منزل پر اور، اور یونیورسٹی کی منزل پر اور۔ ابتدائی منزل پر زبان سکھانا ہے، الفاظ کا ایک مناسب ذخیرہ دینا ہے اور لکھنے اور پڑھنے کی معمولی استعداد پیدا کرنا ہے، لیکن چونکہ یہ بنیادی معاملہ ہے اس لئے اسباق کی ترتیب اور تدریج کا، در طلبہ کی عمر کا اور اس علاقے کا جس میں وہ رہتے ہیں خاص طور سے خیال رکھنا ہے۔ ثانوی منزل پر زبان کے ساتھ کچھ ادب کا بھی شعور پیدا کرنا ہے۔ طالب علم کو نظم و نثر صحیح طور پر پڑھنے اور صاف ستھری اور صحیح عبارت لکھنے کی عادت ڈالنا ہے یہاں یہ کوشش غلط ہوگی کہ طالب علم قدیم ادب سے اچھی طرح واقف ہو یا جدید ادب سے پوری طرح واقف ہو۔ یہاں تمام ادوار اور تمام اصناف کی نمائندگی بھی مناسب نہ ہوگی مثلاً ثانوی تعلیم کی منزل پر غزل کے چند نمونوں سے واقفیت کافی ہوگی اس پر زیادہ زور دینا مناسب نہ ہوگا۔ نظمیں بھی ایسی لینی ہوں گی جن میں منظر نگاری ہو یا کوئی ایسا قصہ ہو جس سے ایک اخلاقی یا سماجی نکتہ پیدا ہوتا ہو، مگر محض وعظ و پند نہ ہو، یا ایسے انتخابات ہوں جو طالب علم میں زندگی کا ولولہ، مشکلات کو دور کرنے کا عزم، وطن کی محبت، انسانیت کا احترام پیدا کریں اسی طرح نثر میں فسانۂ عجائب کے اسلوب پر زیادہ توجہ مناسب نہ ہوگی۔ میرامن یا حیدری کے اقتباسات کے علاوہ غالب کے خطوط، سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی، فرحت اللہ بیگ، پریم چند، ذاکر حسین، عابد حسین، سیدین، مجیب جیسے لوگوں کی نثر زیادہ مفید ہوگی۔ مگر انتخابات میں تنوع کا خیال رکھنا پڑے گا اور مواد اور اسلوب دونوں پر توجہ رکھنی ہوگی۔ اس کے ساتھ قواعد کے اہم اصولوں اور خاص خاص صنائع بدائع سے آشنا کرنا ضروری ہوگا۔ اس منزل پر ایسی مشقیں بھی ضروری ہیں جن کے ذریعہ سے طلبہ سبق کے اہم نکتوں کو اخذ کر سکیں اور انھیں صاف ستھری زبان میں پیش کر سکیں۔ لکھنے والوں کے اسلوب کا تجزیہ اس منزل پر مناسب نہیں ہوگا۔ کالجوں میں ضرور ادب کے تنقیدی

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۵ روپے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

معلومات کی ترسیل کی جا سکتی ہے اور یہاں ادب کا ایک تاریخی تصور بھی دیا جا سکتا ہے یہاں قدیم پر مناسب توجہ کے ساتھ جدید نثر و نظم کو بھی شامل کرنا چاہیے تاکہ ایک جامع شعور پیدا ہو سکے۔ ایم۔ اے کی منزل پر آزادانہ اظہار رائے کو اہمیت دینی ہوگی۔ اگر ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہماری درسی کتابوں میں خاصی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ عام طور پر اب تک جو انتخابات ہوئے ہیں، ان کا مقصد واضح نہیں ہوتا۔ کچھ ریاستوں میں اب درسی کتا [illegible] نے کا کام سرکاری اداروں کے سپرد [illegible] ہونا چاہیے مگر لازمی طور پر ایسا [illegible] کام میں ہر منزل کے استادوں کو شر [illegible] یونی ورسٹیوں کے اساتذہ میں کم ایسے ہیں جو ابتدائی اور ثانوی درجوں کے طلبہ کی ضروریات سے پوری طرح واقف ہوں، دوسرے ان استادوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تدریس کے طریقوں سے آشنا ہوں، تیسرے انھیں لسانیات کے مبادیات کا علم ہو، چونکہ انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس موضوع پر جو ذخیرہ ملتا ہے اس پر بھی ان کی نظر ہو، عام طور پر ایسا نہیں ہوتا، ثانوی منزل پر جو کتابیں ملتی ہیں ان میں زیادہ تر پرانی شراب نئی بوتلوں میں ہوتی ہے۔ اب چونکہ اردو کی تعلیم کا معیار گر رہا ہے اس لئے کچھ لوگ ہر چیز کو آسان رکھنا چاہتے ہیں۔ معاملہ آسانی یا مشکل کا نہیں، موزونیت کا ہے اور ہر درجے اور عمر کے مطابق موزونیت کا ہے، سبق انتخاب کرتے وقت اپنی پسند نہیں، طالب علم کی عمر، اس کی ذہنی استعداد، اس کی اخذ و قبول کی صلاحیت کو دیکھنا چاہیے، ہر کتاب کا تعلق پچھلی اور اگلی کتابوں سے ہونا چاہیے، یعنی یہ کہاں سے چلیں اور کہاں پہنچیں۔

عرصے سے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس کا کام صرف علمی مشورہ دینا ہو اور جو ماہرین سے اچھی اور معیاری کتابیں تیار کرائے جنھیں مختلف ریاستیں مختلف منزلوں کے لئے استعمال کر سکیں۔ انجمن یہ کام کر سکتی ہے۔ مگر اس میں ایک بڑی دشواری ہے، انجمن کے پاس کوئی ایسا اسم اعظم نہیں ہے جس کے بل پر وہ اپنی کتابیں مختلف ریاستوں میں منظور کرا سکے۔ اول تو علاقائی پاسداری اس منظوری میں حارج ہوگی، دوسرے انجمن کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ مختلف ریاستوں کے افسروں کی چشم کرم کی امید میں مسودے تیار کرا کے ان کی خدمت میں بھیج سکے۔ انجمن نے پھر بھی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے اور مناسب اقدامات پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے جس کا جلسہ جولائی میں ہوگا۔ اس سلسلے میں اگر ہماری زبان کے پڑھنے والے ہمیں اپنے مشوروں سے نوازیں تو ان پر کمیٹی ضرور غور کرے گی۔

(باقی)

شاعرات اور شعراء کرام کی توجہ کے لئے

ادارہ تاج الادب دلی نے ہندوستان کے کم و بیش تمام شہروں میں ایسے مراکز اور منتظمین کا انتظام کر دیا ہے جن کی وساطت سے تمام معروف اور غیر معروف شاعرات و شعراء کرام کی تصاویر، من پسند تخلیق و منظومات دلی کے مرکز کو بھیجی جا سکتی ہیں اس کا مقصد موجودہ دور کے شعراء اور شاعرات کی زندگی و کلام کو علیحدہ علیحدہ یادداشت کی صورت میں شائع کرنا ہے لہٰذا جن شاعر و شاعرات کو ایسی سہولت فراہم نہ ہو سکی ہو ان سے درخواست ہے کہ وہ جلد سے جلد حسب ذیل معلومات سے براہ راست ادارہ تاج الادب [illegible] اردو بازار دلی ۶ کو مطلع فرما دیں۔ تاکہ انھیں علیحدہ علیحدہ شریک اشاعت کیا جا سکے۔

(۱) ایک تصویر (عام سائز سے زیادہ بڑی) بغیر اسکرین کے کاغذ پر (تصویر کی پشت پر اپنے دستخط اور تاریخ)

(۲) تخلیق۔ اپنی من پسند دو نظمیں یا دو غزلیں۔

(اپنے تاثرات کے نیچے دستخط، پورا پتہ اور تاریخ ضرور تحریر کریں۔

(۳) حالات زندگی۔ جو خود اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہوں

(نوٹ) یہ سب کچھ خود شاعر یا شاعرات کی اپنی تحریر پر مشتمل ہو ورنہ ناقابل اشاعت تصور کیا جائے گا۔

(نوٹ ۲) یادداشت کا پہلا مجموعہ شاعرات کے تاثرات و تصاویر اور کلام پر مشتمل ہوگا جو حروف تہجی کے حساب سے ترتیب دے کر شائع کیا جائے گا۔

مخدوم زادہ مختار عثمانی دہلوی ناظم اعلیٰ
ادارہ تاج الادب دلی۔

غلط فہمی کا ازالہ

حال ہی میں جعفر لائبریری مبارکپور (اعظم گڑھ) کے زیر اہتمام 'صد رنگ' کے نام سے غزلوں کا انتخاب اشاعت پذیر ہوا ہے۔ فنکاروں کے تعارف کے باب میں مجھے علامہ نیاز فتحپوری مرحوم کا فرزند قرار دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع یکسر غلط ہے۔ مرحوم میرے ہم وطن اور کرم فرما ضرور تھے اور بس۔

• غلام مرتضیٰ راہی

(ڈاکٹر) سید محمد علی کاظمی

جمال الدین افغانی
اور
ان کا سلسلۂ نسب

جہاں ایک طرف جمال الدین کے تعین وطن کے بارے میں دو رائیں ہیں اور ان کے معتقدین نے اس سلسلے میں دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ غلط فہمیوں کا بھی ایک طومار باندھ دیا ہے کہ وہ افغانی تھے یا ایرانی؟ وہاں دوسری طرف موصوف کے سلسلۂ نسب کے بارے میں بھی ان کے دوستوں، عقیدت مندوں اور پرستاروں نے کافی چھان بین اور بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں بحث کا ایک اہم موضوع سید علی ترمذی ہیں جن سے سید جمال الدین کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ اور جمال الدین کے پرستاروں نے ان سید علی ترمذی کو اتنی چھان بین اور اپنی دانست میں تحقیق کے بعد صاحب طرز مصنف جامع ترمذی سمجھ لیا ہے اور جمال الدین کا ہر جاں نثار اُن کے سابقہ پرستاروں کی تحریر کو حرفِ آخر اور مستند سمجھ کر اس غلطی کو دہراتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

اردو زبان میں جمال الدین کی سیرت پر غالباً سب سے پہلی کتاب "فقیہ المشرق" نامی ہے۔ جو سنہ ۱۹۲۰ء میں ملک پریس مراد آباد سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے مرتب مرزا محمد اسحٰق بیگ مدیر اخبار "اقبال" مراد آباد ہیں۔ جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ

"جمال الدین کا سلسلۂ نسب سید علی ترمذی مشہور محدث صاحب کتاب ترمذی سے ملتا ہوا سید الشہداء امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔" [۱]

"سید جمال الدین افغانی" مرتبہ ضیاء احمد بدایونی میں عبدالرحمٰن سابق مدیر مارننگ نیوز، کلکتہ رقمطراز ہیں کہ

"یہ ملکوتی ہستی سید جمال الدین الحسینی کی تھی جو مشہور محدث ترمذی کی اولاد میں تھے۔ . . . ." [۲]

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ

"ان کے والد کا نام سید صفدر تھا اور مشہور سید علی ترمذی کی اولاد میں سے تھے۔ . . . ." [۳]

"مقام جمال الدین افغانی" مرتبہ مبارز الدین رفعت میں نواب ذوالقدر جنگ بہادر لکھتے ہیں کہ جمال الدین کا سلسلۂ نسب

"سید علی ترمذی محدث سے ہو کر حضرت حسینؓ تک پہنچتا ہے" [۴]

اس کتاب میں جمال الدین کے ایک دوسرے پرستار ... فاروقی (ایم۔ اے) لکھتے ہیں کہ

"جمال الدین کے والد کا نام سید ... محدث کی اولاد میں سے تھے" [۵]

جمال الدین کی مشہور کتاب "تاریخ ..." محمود علی خاں نے بھی اس کتاب کے دیباچہ میں ... کا سلسلۂ نسب سید علی ترمذی محدث سے ملتا ہے اور انتہا یہ ہے کہ جرجی زیدان کی مشہور کتاب "مشاہیر المشرق" میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ جمال الدین کا سلسلۂ نسب سید علی ترمذی محدث سے ملتا ہے اور اسی کتاب کے حوالے سے جرجی زیدان کے بیان کو مستند مانتے ہوئے "آثار جمال الدین" میں قاضی عبدالغفار نے بھی یہی لکھ دیا ہے۔ قاضی صاحب کے بقول جمال الدین کے دوست مسٹر بلنٹ اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ بھی اسی خیال کے ہم نوا ہیں اور اپنے اس بیان کو خود جمال الدین سے منسوب کرتے ہیں۔

"آثار جمال الدین" میں قاضی صاحب نے ان دو حضرات کے علاوہ چند دوسرے معتبر اور مستند حضرات کی تحریروں سے بھی حوالے دئے ہیں جن میں ان سید علی ترمذی کو مشہور محدث بتایا گیا ہے اور خود قاضی عبدالغفار بغیر کسی تبصرہ یا ذاتی رائے کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس بات سے یہ گمان ہوتا ہے کہ خود قاضی صاحب بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھے۔ اور ان کے ذہن میں بھی یہ بات صاف نہ تھی کہ سید علی ترمذی مشہور محدث مولف صحیح ترمذی نہیں ہیں۔

قاضی عبدالغفار پر "آثار جمال الدین" میں اس غلط فہمی کو دور نہ کرنے کا الزام اس وجہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ سید عبدالجبار شاہ سابق والئ ریاست سوات کی کتاب کے مسودہ سے جو اقتباسات قاضی صاحب نے اپنی کتاب "آثار جمال الدین" میں ضمیمے کے طور پر شامل کئے ہیں ان میں اس سلسلے میں پوری وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ دونوں حضرات بالکل مختلف شخصیتوں کے مالک ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ ان اقتباسات کو نقل کرنے کے باوجود قاضی صاحب کا اس طرف دھیان نہیں گیا کہ وہ خود بھی اپنی کتاب کے صفحات میں اس غلط فہمی کا ذکر کر دیتے۔ یا پھر عبدالجبار شاہ کے اسی

---

۱ "فقیہ المشرق" جمال الدین کی سوانح عمری، از مرزا اسحٰق بیگ ایڈیٹر اخبار اقبال مراد آباد جون ۱۹۲۰ء

۲ "سید جمال الدین افغانی" ص ۲، ص ۵۔ مرتب ضیاء احمد بدایونی۔ طبع ثانی۔ جولائی ۱۹۵۳ء

۳ "مقام جمال الدین افغانی" ص ۱۰ مرتبہ مبارز الدین رفعت ۱۹۴۹ء نفیس اکیڈمی کراچی ص ۱

۴ "مقام جمال الدین افغانی" ص ۱۰ مرتبہ مبارز الدین رفعت ۱۹۴۹ء نفیس اکیڈمی کراچی ص ۱

۵ " " " " " " " " "

بیان کی تردید کرتے۔ قاضی صاحب کی اس طرف سے عدم توجہی اس بات کی غمّاز ہے کہ "آثار جمال الدین" کے مرتب کرنے میں ان کا مقصد "جمال الدین" کے حالاتِ زندگی کی صحیح اور مکمل عکاسی نہ تھا بلکہ ان کے ذہن میں کوئی اور مقصد تھا جس کو وہ اپنی دانست میں یہ کتاب تالیف کر کے پورا کر چکے تھے۔ اور وہ مقصد یقیناً جمال الدین کی سیاسی زندگی کی اپنے مقدور بھر مکمل یا نامکمل ترجمانی کر دینا تھا۔ اور جمال الدین کی زندگی کے دوسرے پہلو اور دوسرے گوشے اُن کی توجہ اور تحقیق کے دائرے سے باہر تھے۔ کتاب کے خاتمے پر سید عبدالجبار شاہ سابق والیٔ سوات کی کتاب کے مسودہ سے اقتباسات پیش کرنے سے قبل قاضی صاحب نے اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ "میں نے ان اوراق کو بطور ضمیمہ شائع کرنا اس لئے ضروری سمجھا کہ اس سرگذشت کے بعض ایسے پہلو بھی جو میری تحقیقات کے دائرے میں شامل نہیں ہیں واضح ہو جائیں۔"۸؎

حالانکہ اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں قاضی صاحب نے اس موضوع بحث کے سلسلے میں کافی حوالے دیے ہیں اور بحیثیں ایرانی و افغانی ثابت کرنے کی بحث سے متعلق جو مواد جمع کیا ہے ضمنی طور پر اس میں جمال الدین کا نسبی سلسلہ بھی زیر بحث آیا ہے۔ بیان اور بحث کا یہ تضاد دلچسپ ہے۔ قاضی صاحب کے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے "آثار جمال الدین" کے ابتدائی باب کی تمام تر بحثیں محض ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور بقول خود مصنف کے یہ مسائل ان کے دائرہ تحقیق میں شامل نہیں ہیں قطع نظر اس امر کے کہ قاضی صاحب نے اس غلط فہمی کا رد نہیں کیا ہے انھوں نے کتاب میں اس بحث کو اٹھایا ضرور ہے اور اس سلسلے میں کافی مواد بھی فراہم کیا ہے۔ قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ "مسٹر بلنٹ اور مفتی عبدہ یہ دو شیخ کے سب سے زیادہ معتبر احباب تھے اور ان دونوں کی شہادتیں قول فیصل ہیں۔ لیکن قطع نظر ان بیانات کے جیسا کہ شروع میں عرض کیا جا چکا ہے فریقین کے درمیان ایسے قضیے کا بہتر فیصلہ خود شیخ ہی کے ایسے بیانات سے کیا جا سکتا ہے جن کی صحت ناقابل انکار ہو۔ اور یہی فیصلہ قطعی فیصلہ ہو سکتا ہے۔"۹؎

اس کے بعد قاضی صاحب نے بلنٹ کے روزنامچے سے اقتباسات اور حوالے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "جب بلنٹ نے شیخ سے اس باب میں سوال کیا تو شیخ نے فرمایا کہ ان کے خاندان کے مورث اعلیٰ سید علی ترمذی مولف صحیح ترمذی تھے جن کو ۸۰ برس پہلے امیر تیمور ترمود (ترکستان) سے افغانستان لائے تھے۔۔۔"۱۰؎

مقام تعجب ہے کہ بلنٹ نے اس بیان کو جمال الدین سے کیسے منسوب کر دیا۔ اور اگر حقیقتاً انھوں نے ایسا کہا تو یہ امر اور بھی زیادہ حیران کن ہے کہ جمال الدین جیسا باخبر اور علم و فضل کا انسان مشہور محدث ترمذی کے بارے میں صحیح واقفیت نہ رکھتا ہو۔ اتنا علم تو حدیث کے ایک عام طالب علم کو بھی ہونا چاہیے۔

آثار جمال الدین میں قاضی صاحب نے سید عبدالجبار شاہ کی کتاب سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں نہایت صراحت کے ساتھ اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ جمال الدین کے سلسلۂ نسب میں جن علی ترمذی کا نام آتا ہے وہ مشہور محدث علی ترمذی نہیں ہیں عبدالجبار شاہ لکھتے ہیں کہ "سید جمال الدین افغانی کا نسبی معاملہ اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اس کو چھپانا یا اس کے متعلق کسی مغالطے میں پڑنا ناممکن ہے۔۔۔۔ بوجہ بعد مملکت دوسرے لوگ اس سلسلے سے بے خبر ہیں مگر افغانستان میں کل اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ ایسا ہی مغالطہ مفتی محمد عبدہ کو ترمذی کے نام سے لگا ہے کہ وہ صاحب طرز مصنف جامع ترمذی ہے اس بارے میں نہ تو سید افغانی کی طرف ایسی فاش غلطی منسوب کی جا سکتی ہے اور نہ ہی مفتی عبدہ کی طرف کہ وہ علم حدیث کے ان اعظم مصنفین کے نام اور نسب و حسب سے بے خبر تھے۔ یا اُن کو معلوم نہ تھا کہ مصنف جامع ترمذی جس کا نام محمد بن عیسیٰ اور جس کو ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ حافظ لکھا ہوا ہے ان سید علی ترمذی سے جدا ہیں!"۱۱؎

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اس واضح تردیدی بیان و حوالے کے باوجود قاضی صاحب نے کتاب کے ابتدائی باب میں بلنٹ کے روزنامچے کی تحریر کو حرف آخر سمجھ لیا ہے کیونکہ بلنٹ نے اس بیان کو خود جمال الدین کے نام سے منسوب کیا ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایرانی اور افغانی دونوں حضرات جمال الدین کو متفقہ طور پر حضرت امام حسین کی اولاد سے مانتے ہیں۔ اور مولف صحیح ترمذی کا فاطمی سادات یا امام حسین کی اولاد سے ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا ہے۔ دونوں کے سلسلۂ نسب میں کسی طرح کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے سید علی ترمذی اور محدث ترمذی ہم عصر بھی نہ تھے۔ بلکہ دونوں کے بیچ کئی صدیوں کا تفاوت ہے۔ تعجب ہے کہ ان واضح اور روشن حقائق کے باوجود مفتی عبدہ، بلنٹ اور جمال الدین کے دوسرے پرستار، دوست، احباب اور سوانح نگار سب ہی آج تک ان کے سلسلۂ نسب کو مشہور محدث ترمذی سے کس طرح جوڑتے رہے ہیں!

اپنے ایک مضمون میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مولف صحیح ترمذی کے بارے میں لکھا ہے کہ "مولف صحیح ترمذی ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے ان کا نام محمد تھا ابن عیسیٰ کنیت تھی جو صورت قبیلۂ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے نسب نامہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے محمد ابن سورہ بن موسیٰ ابن ضحاک سلمی ترمذی!"۱۲؎

اس اقتباس سے مزید اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ دونوں شخصیتیں مختلف تھیں اور مولف صحیح ترمذی کا سلسلۂ نسب و قبیلہ بالکل دوسرا تھا۔

۸؎، ۹؎، ۱۰؎ "آثار جمال الدین" مرتبہ قاضی عبدالغفار، صفحہ ۲۰۱؛ ۱۸۷-۱۸۸، صفحہ ۱۸۱

۱۱؎ "آثار جمال الدین" مرتبہ قاضی عبدالغفار، صفحہ ۳۲-۳۳

۱۲؎ ماہنامہ صبح صادق، لکھنؤ، حدیث نمبر، جولائی دسمبر ۱۹۵۶ء

رحم علی الہاشمی

تاثرات (۳)

مرزا محمد ہادی عزیز

زمانۂ طالب علمی میں لکھنؤ کی شاعرانہ فضا میں مجھے بھی شعر کہنے کا شوق ہوا۔ پہلے مجنوں کے تخلص کے ساتھ کچھ تک بندی کی اور پھر ہاشمی کے تخلص کے ساتھ باضابطہ شعر کہنے لگا مگر شاعری کے لئے ایک استاد کی ضرورت تھی اور استاد کا انتخاب کرنے کے لئے میں ادبی رسالوں میں مختلف شعرا کے کلام کا مطالعہ کرنے لگا۔ کچھ دن بعد حلقۂ انتخاب لکھنؤ کے تین شعرا ثاقب، صفی، عزیز میں محدود ہوگیا اور انھیں تین میں کبھی ایک کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف رجحان ہوتا رہا۔ بلکہ ایک صحبت میں حضرت ثاقب سے ملاقات ہوئی تو ان سے میں نے کہہ بھی دیا کہ میں اپنی غزل لے کر اصلاح کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور انھوں نے رضامندی بھی ظاہر کی۔ لیکن چند دن بعد رسالہ مخزن لاہور میں حضرت عزیز کی ایک غزل دیکھی جس کا ایک شعر تھا ؎

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی　　اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

اگرچہ یہ شعر حضرت عزیز کے بہترین اشعار میں نہ تھا مگر اس وقت میرے دل پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ مخزن کو الگ رکھ کر اسی وقت امین آباد ہائی اسکول گیا جہاں حضرت عزیز اردو کے مدرس تھے اور اسکول کی چھٹی ہونے کے وقت تک باہر انتظار کرتا رہا جب چھٹی ہونے پر وہ باہر نکلے تو ان کے ہمراہ ان کے مکان نخاس میں گیا اور باضابطہ ان کا شاگرد ہوگیا۔

حضرت عزیز معیار پارٹی کے ممتاز رکن تھے جس کے مشاعرے ہر ماہ کسی نہ کسی رکن کے مکان پر ہوتے تھے اور ان مشاعروں میں حضرت عزیز اپنے ہمراہ مجھے بھی لے جانے لگے جس سے مجھے لکھنؤ کی شاعری کے ممتاز اراکین سے ملاقات اور مشاعرے میں ان کا کلام سننے کا موقع ملا۔ کچھ دنوں بعد جب مجھے معیار پارٹی کے اندرونی حالات معلوم ہوئے اور جناب یاس عظیم آبادی (بعد کے یگانہ چنگیزی) اور حضرت بیخود موہانی کی اس سے کنارہ کشی کا ذکر سنا تو مجھے خیال ہوا کہ ان دونوں کو حضرت عزیز سے ملانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں نے کیننگ کالج بورڈنگ ہاؤس کے کامن ہال میں ایک مختصر سا مشاعرہ کیا جس میں حضرت عزیز کے ساتھ بیخود اور یاس کو بھی بلایا لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی اس لئے کہ بیخود کے ایک شعر کو حضرت عزیز نے اپنے اوپر چوٹ خیال کیا اور مشاعرے میں اپنی غزل نہیں پڑھی بلکہ بعد کو میرے کمرے پر آکر سنائی۔ مجھے اپنی اس کوشش کی ناکامی کا دکھ ہوا لیکن بعد کو حضرت عزیز مجھے ساتھ لے کر بیخود کے گھر پر گئے اور ان سے صلح صفائی ہوگئی۔ مگر یاس نے جو روش اختیار کر رکھی تھی اس کی وجہ سے ان سے میل کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت عزیز جیسے بلند پایہ شاعر تھے ویسے ہی ان کے شعر پڑھنے کا انداز بھی بلند آہنگ تھا جس سے وہ مشاعرے پر چھا جاتے تھے اور حاضرینِ مشاعرہ ان کی تعریف و تحسین پر مجبور ہو جاتے تھے۔

حضرت عزیز کی دو بیویاں تھیں، ایک منکوحہ اور ایک متاعی اول الذکر ان کے ساتھ نخاس میں ان کے مکان میں رہتی تھیں اور آخر الذکر محلہ مولوی گنج کے ایک مکان میں۔ اسکول کی اردو مدرسی کی تنخواہ دو گھروں کو چلانے کے لئے کافی نہ تھی اس لئے وہ ہمیشہ مالی پریشانیوں میں مبتلا رہتے تھے بلکہ اکثر فرماتے تھے کہ جس اہل علم کو میں خوش حال دیکھتا ہوں اس کی علمیت میں مجھے شبہہ ہوتا ہے۔

اسکول کی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد مہاراجہ صاحب محمود آباد نے انھیں اپنے بڑے صاحبزادے مہاراج کمار امیر حیدر خاں کی اتالیقی اور محمود آباد اسٹیٹ لائبریری کی نگرانی پر مقرر کر دیا اور وہ لکھنؤ سے محمود آباد منتقل ہوگئے لیکن آخر میں بیمار ہو کر لکھنؤ آگئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ سوگواروں میں ان کے اہل خاندان کے علاوہ لکھنؤ اور بیرونجات کے مشاہیر شعرا اور اہل علم شریک تھے۔

حضرت عزیز کا ایک شعر تھا ؎

دل تو سمجھا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے
میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

یاس عظیم آبادی نے اس شعر پر نہایت رکیک اعتراضات کئے اور اس میں فحش معنی پیدا کئے۔ حضرت عزیز نے اس پر حضرت اکبر الہ آبادی کو توجہ دلائی تو انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی اور اس پر اعتراض کو معترض کی کج فہمی پر محمول کیا اور اس شعر کو اکثر لطف لے کر پڑھتے رہتے تھے۔

حضرت عزیز کی شیروانی اور کپڑے بہت صاف ستھرے رہتے تھے اور وہ عموماً چوڑی مہری کا پاجامہ پہنتے تھے۔ باوجود سخت مذہبی ہونے کے وہ تعصب سے بالکل پاک تھے۔ عربی کی تعلیم انھوں نے فرنگی محل کے علما سے حاصل کی تھی اور کئی ہندو جوان کے شاگرد تھے ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ خاص کر جگت موہن رواں وکیل اناؤ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی غزلوں کی اصلاح پر خاص توجہ کرتے تھے چنانچہ رواں صاحب بھی ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔ حضرت عزیز نے گلدہ پر مقدمہ لکھنے کے لئے اپنے ممتاز شاگردوں کو نہیں منتخب کیا بلکہ مجھ سے لکھوایا حالانکہ اس وقت میں طالب علم تھا۔ معیار کے ایک مشاعرہ میں ایک صاحب نے میرا ایک شعر کر کے پڑھا یا تو حضرت عزیز کو شبہہ ہوا کہ شاید اس میں کوئی سقم ہے چنانچہ اس شعر کو انھوں نے بدل دیا اور کسی قسم کے تکدر کا اظہار نہیں کیا جو ان کی عالی ظرفی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔

(ڈاکٹر) شمیم حنفی

سندھی زبان کا مستقبل

ہندوستان میں

(۲ر نومبر سنہ کو دلّی میں، ڈاکٹر کے۔ آر۔ سری نواس آئنگر نائب صدر ساہتیہ اکیڈمی نے سندھی زبان کے عالموں اور ادیبوں کے ایک اجتماع سے خطاب کیا تھا۔ ان کی تقریر ہندوستان میں سندھی زبان کے مستقبل سے متعلق تھی لیکن جن مسائل پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا وہ اردو زبان کے مسائل سے کئی مماثلتیں رکھتے ہیں، چنانچہ ان کی تقریر میں اردو کا ذکر بھی کئی موقعوں پر آیا۔ ذیل میں ڈاکٹر آئنگر کی تقریر کے بعض ایسے حصّوں کی تلخیص پیش کی جاتی ہے جو اردو زبان کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ تلخیص ہماری فرمائش پر ڈاکٹر شمیم حنفی نے کی ہے۔) ادارہ

جدید سندھی ادب کی تاریخ کا آغاز پندرھویں صدی سے ہوتا ہے۔ اس تاریخ کا سب سے روشن باب شاہ عبداللطیف کی تخلیقات ہیں جن میں تصوف اور بھکتی، اسلامی فکر اور ہندو فلسفے کی آمیزش نے وہ دلآویزی پیدا کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ شاہ لطیف کی روایت کو ساچل اور سامی نے آگے بڑھایا۔ پھر فارسی اثرات کا دور آیا اور اس کے بعد مرزا قلیچ بیگ اور دیارام گدومل وغیرہ نے ایک جدید نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم نے ہر ہندوستانی کو متاثر کیا۔ لیکن ملک کے بعض حصّے مثلاً بنگال، پنجاب اور سندھ کے لئے تقسیم کا زخم زیادہ کاری ثابت ہوا۔ سندھی ہندوؤں کو اپنا وطن چھوڑ کر قدم جمانے کے لئے نئی زمینوں کی تلاش کرنی پڑی۔ اب سندھی ایک ایسی زبان ہے جس کا کوئی علاقہ نہیں اور پاکستان میں سندھ وہ علاقہ ہے جس کی کوئی زبان نہیں۔ لیکن حالات بدل رہے ہیں اور تبدیلیوں کی رفتار نے حالات کے بدترین موڑ پیچھے چھوڑ دئے ہیں۔

ان حالات میں آزادی کے بعد ظہور میں آنے والے سندھی ادب پر تقسیم کے المیے کا واضح اثر نظر آنا فطری ہے۔ لیکن اس دور کے ادب سے سندھیوں کی قوتِ برداشت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی استعداد کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ شعر و ادب کی مختلف صنفوں میں سندھی ادیبوں نے نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں۔ پچھلے دس برسوں میں سندھی زبان نے پانچ ساہتیہ اکیڈمی انعامات حاصل کئے۔ سندھی جیسی "بے علاقہ زبان" کے مسائل کے پیشِ نظر یہ امتیاز بہت اہم اور معنی خیز ہے۔

سندھی زبان جن مشکلات سے دوچار ہے ان کی موجودگی میں اس زبان کے مستقبل کی طرف سے مایوسی کا اظہار کرنا مشکل نہیں۔ پنجابی، اردو، بنگالی اور سندھی کا سرمایہ ہندوستان اور پاکستان میں بٹا ہوا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ زبان و ادب کی سطح پر دونوں ملکوں کے تعلق کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ ایک موقع پر امریکی نوآبادیوں نے برطانیہ سے تعلقات منقطع کرلئے تھے لیکن ان کی مشترکہ زبان کچھ ہی عرصے میں انھیں پھر ایک دوسرے سے قریب لے آئی۔ قانون جن حقائق کو تقسیم کرتا ہے، جذبے کی زبان انھیں پھر متحد کردیتی ہے۔ ادب بھی جذبات کی زبان ہے۔ سیاسی مضامین اور تقریریں ہنگامی اور وقتی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں، ادب کسی حدِ زماں کو قبول نہیں کرتا۔ آج نہیں تو آئندہ کبھی نہ کبھی سیاست کے جبر سے بٹے ہوئے ذہن اور منقسم شعور کو ایک ساتھ مل کر آگے بڑھنا ہوگا۔ رسم الخط اور ڈاک پر پابندیوں سے متعلق دشواریاں برحق لیکن ایک دوسرے کو سمجھنے کے ذرائع یکسر ختم نہیں ہوسکتے۔ مثال کے طور پر ریڈیو ایک موثر آلہ ہے۔ اس کے ذریعہ دو ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کو سن تو سکتے ہیں اور شاعری بہرحال سننے کی چیز ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ شاعر کی صورت اور اس کے رسم خط سے واقفیت بھی ہو۔ ادب کی جمہوریت سچی جمہوریت ہے اور شعرا اس شعور اور پُراسرار قوت کے مالک ہیں جو افراد کے درمیان فاصلوں کو مٹانے پر قادر ہے۔

ہندوستان میں سندھی زبان کا کوئی علاقہ متعین نہیں اس طرح سنسکرت اور اردو کی طرح اب سندھی زبان بھی ہندوستان کے ہر علاقے کی ملکیت ہے۔ رفتہ رفتہ یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہوتی جائے گی۔ ایک مخصوص مقامی یا علاقائی انفرادیت سے محروم ہو کر غالباً سندھی کا دائرہ اثر اور زیادہ وسیع اور کشادہ ہوتا جارہا ہے۔ مختلف علاقوں میں اس کے خدوخال مختلف ہوتے جارہے ہیں۔ انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبان کو ایک عالمی زبان کا امتیاز حاصل کرنے کے لئے اپنے اندر یہ لچک پیدا کرنی پڑی کہ وہ مختلف علاقوں کے اثرات جذب کرکے اپنے آپ کو مختلف رنگوں میں پیش کرسکے۔ بمبئی، دلّی اور کلکتہ کے سندھی جو زبان بولتے ہیں وہ سندھی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے قدرے مختلف بھی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھار کسی مخصوص علاقے میں یہ زبان اس علاقے کا مروجہ رسم خط بھی اپنالے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے میں نے ایک پوسٹ کارڈ میں سندھی زبان اڑیہ رسم خط میں لکھی ہوئی دیکھی، ظاہر ہے کہ لکھنے والا یا اس کا مخاطب سندھی سے واقف تھے لیکن دیوناگری رسم خط سے ناآشنا رہے ہوں گے۔ ہم لوگ خلائی عہد میں داخل ہوچکے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ راسخ اور بے لوچ ذہنی معتقدات کا تحفظ ہمارے لئے دشوار ہوتا جائے گا۔

سندھی ادب کا ایک اور اہم مسئلہ اس کی کتابوں کی

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

مراسلات

غالب کا متنازع شعر

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

عرصہ دراز سے یہ شعر معرض بحث میں ہے۔ ہماری زبان مورخہ ۲۲ رجولائی ۷۰ء میں جناب موسیٰ مجروح نے بحوالہ حضرت آرزو لکھنوی دسر دش گلی شہری اس شعر کو صفدر مرزا پوری کا نتیجہ فکر بتلایا تھا۔ اشاعت مورخہ ۱۵ اپریل ۷۱ء میں جناب ثاقب کانپوری نے بھی اپنے ذاتی علم کی بنا پر اس کی تصدیق فرمائی ہے۔ لیکن اشاعت مورخہ ۱۵ مئی ۷۱ء میں جناب برہم ناتھ دت صاحب نے قراین سے اس کو غالب کا شعر قرار دیتے ہوئے یہ بھی وضاحت فرمائی ہے کہ یہ شعر اگر صفدر کا ہوتا تو یوں ہوتا۔

میرے خیال میں اس کا قطعی فیصلہ اس وقت جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی کے ہاتھ ہے۔ کیونکہ صفدر مرزا پوری کا غیر مطبوعہ دیوان حسن اتفاق سے صاحب موصوف کے پاس موجود ہے۔ (ملاحظہ ہو مکتوب صاحب موصوف ہماری زبان مورخہ ۲۲ مئی ۷۱ء) اگر بزرگ محترم بہ معائنہ دیوان مذکور اس شعر کے نسبت عالمانہ رائے کا اظہار فرمائیں تو اہل ادب اس سے مستفید ہوں گے اور ممکن ہے کہ اس شعر سے متعلق دستاویزی شہادت بھی مہیا ہو جائیں۔

حیدر آباد　　　● دادا بھائی کاؤس جی

مزار محمود پر حاضری

"ہماری زبان" کے پچھلے شماروں میں پروفیسر محمود شیرانی کے مزار سے متعلق کئی خبریں شائع ہو چکی ہیں ٹونک پہنچا تو بے اختیار جی چاہا کہ وہاں جا کر حاضری دوں اور اس قابل احترام ہستی کے مرقد سے کسب فیض کروں۔ چنانچہ ۲ رجون کی سہانی صبح کو ہم سائیکلوں پر روانہ ہوئے۔ میرے ہمراہ میرے عزیز محمد اسماعیل تھے۔ باناس ندی کے کراج گھاٹ پر ایک نئی تعمیر شدہ قبر ڈھونڈنے میں ہمیں ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی۔ سیمنٹ سے بنی یہ پختہ قبر دور ہی سے نظر آ گئی اور ہم کھیتوں کو پار کرکے کشاں کشاں وہاں پہنچے۔ کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ برلب دریا کھلی فضا میں یہ تنہا قبر بڑا دل فریب منظر پیش کر رہی تھی مگر

"بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے" والا معاملہ سامنے تھا اور آنکھیں حسرت و عبرت کا ایک شاندار مرقع دیکھ رہی تھیں۔ قبر پر چند ابلے ہوئے چنے کے دانے پڑے تھے، قریب ہی راکھ میں دبے ہوئے انگارے دھواں دے رہے تھے اور ایک اگربتی سلگ رہی تھی۔ ادھر ادھر دو ایک مٹی کے ٹوٹے پھوٹے پیالے اور دنے پڑے تھے۔ قبر سے تھوڑے فاصلے پر ایک چوکور پختہ چبوترا بنا ہوا ہے جہاں اہل ہنود کے پوجا پاٹ کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ شاید کسی عقیدت مند نے یہاں بھی آرتی اتاری ہوگی۔ لوح مزار کو دیکھا تو حسب ذیل الفاظ کندہ تھے۔

خداوند غفار

۱۹۴۶ء

مرقد

ڈاکٹر حافظ محمد محمود خاں شیرانی

ولادت ۔ ۵ راکتوبر ۱۸۸۰ء

وفات ۔ ۱۵ رفروری ۱۹۴۶ء

برلب باناس در وادی اقامت گاہ کرد
تا ببارد ابر رحمت درمقام بے کسی
طالب بگی ۔ مظہر محمود شیرانی
(۱۹۴۶ء)

شعر پڑھتے سے ویرانے میں قبر کا جواز مل گیا۔ موصوف زندگی میں ہی نہایت تنہائی پسند تھے۔ موت کے بعد بھی دریا کے کنارے کنج تنہائی تلاش کر لیا۔ میں دوسرے مصرعے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک ایک رحمت کی بدلی آئی اور تیز بوچھار نے ہم دونوں کو بھگو دیا۔ بہ مشکل وہاں سے بھاگ کر پیڑوں کے نیچے پناہ لی۔ واضح رہے کہ مصرع ثانی سے مادہ تاریخ وفات ۱۹۴۶ء نکالا گیا ہے جب کہ تمام حروف کے اعداد ۱۹۴۸ء ہوتے ہیں ممکن ہے کہ مصرع اس طرح ہو گا "تا ببارد ابر رحمت برمقام بے کسی" اور کاتب نے "برمقام" کی جگہ "درمقام" کر دیا ہو۔ بہر حال اس کی تصحیح ضروری ہے۔

ٹانگور　　　● مختار ٹونکی

اخبار و افکار

آئین کی دفعات کے مطابق اردو کے مسئلہ کو حل کرنے پر زور

نئی دہلی:۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کانگریس پارلیمانی پارٹی کی نئی ایگزیکیٹو کے پہلے اجلاس میں تقریر فرماتے ہوئے اردو کے مسئلے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں اردو کا مختصراً تذکرہ کیا اور فرمایا یوپی، بہار اور دلی میں اردو کا مسئلہ بے حد اہم ہے اور آئین میں جو دفعات ہیں ان کو جامہ عمل پہنایا جانا چاہیے۔

• الجمعیۃ دہلی

امریکہ اور کناڈا میں اردو کی تعلیم

حیدرآباد:۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے کل شام ایوان اردو میں ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن بارکر صدر شعبہ اسلامیات دار دو مانٹریال یونیورسٹی کناڈا کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارہ نے ڈاکٹر بارکر کی گرانقدر علمی، ادبی اور تحقیقاتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کناڈا میں اردو کی تعلیم کو فروغ دینے میں موصوف کی خدمات کی ستائش کی اور ڈاکٹر بارکر کے ہندوستانی علوم اور زبانوں سے واقفیت اور اردو سے والہانہ عشق کے جذبے کو مثالی قرار دیتے ہوئے انھیں خراج تحسین ادا کیا۔ ڈاکٹر بارکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی ہمہ جہتی ترقی سے بے حد متاثر ہیں ہندوستان میں حیدرآباد ہی ایسا شہر ہے جہاں تحقیقی اور تخلیقی کام سائنٹفک اصولوں پر ہو رہا ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو اور اس کے ترجمان سب رس کے خدمات کی بھی موصوف نے ستائش کی اور اس خیر مقدمی تقریب کے انعقاد پر ممنونیت کا اظہار کیا۔ امریکہ میں اردو زبان کی تعلیم کے بارے میں وضاحت سے روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر بارکر نے بتایا کہ امریکہ اور کناڈا کی (۲۲) یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہندی بھی چند مقامات پر پڑھائی جاتی ہے۔ پچھلی عالمی جنگ کے بعد سے امریکہ میں اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا۔

صدر کینیڈی کے عہد حکومت میں اردو تعلیم کے لئے امریکیوں کو وظائف بھی ملتے رہے۔ ڈاکٹر بارکر نے کہا کہ امریکی عوام ہندوستان کی اس خوبصورت زبان اردو اور اس کے گرانقدر ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اردو و الفاظ شماری، اردو صحافتی زبان اور اردو شاعری پر روشن اور اردو رسم الخط میں مطبوعہ نصاب سے اردو میں اعلیٰ تعلیم کی طرف امریکیوں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

• سیاست

تلک ودیا پیٹھ کے پچاس سالہ یوم تاسیس کے موقع پر

مرہٹی میں غالب پر ایک کتاب کی رسم اجراء

۲۲ مئی کو تلک مہاراشٹر ودیا پیٹھ پونا کی طرف سے پچاس سالہ یوم تاسیس کے موقع پر مرہٹی کے ممتاز صحافی، مقرر اور ڈرامہ نگار شری وِدیا دھر گوکھلے کی اردو کے مشہور شاعر غالب پر ایک اہم اور معیاری تصنیف "شاعر اعظم غالب" کی رسم اجرا بڑی شان سے منائی گئی یہ کتاب گولڈن جبلی کے مجوزہ مختلف سلسلۂ مضامین کی پچاس کتابوں میں چھپی کتاب ہے یہ ادارہ مہاراشٹر کی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر، ہندوستانی تہذیب، سنسکرت کی معلومات پر مختلف مذاہب اور علاقائی تاریخ، ادب و ثقافت پر بنیادی سائنس اور تا حال ان کی ترقیوں کی معلومات پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ اس ادارے کی مطبوعات میں غالب پر اس کتاب کی شمولیت سے اس کے وسیع قومی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ غالب انسانی قدروں کے ایک بے لوث پرستار کی حیثیت سے قوم کی جذباتی ہم آہنگی اور یکجہتی کی جیتی جاگتی مثال تھے۔

تقریب کی صدارت وائس چانسلر پروفیسر ڈی۔ کے۔ پوت دار نے کی، اور کتاب کے اجرا کا اعلان مہاراشٹر کے مشہور شاعر شری جی۔ ڈی۔ مڈگلکر نے کیا۔

اس موقع پر شری مڈگلکر نے اس کتاب کے مشمولات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ شری ودیا دھر گوکھلے نے بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرہٹی میں یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے جو قابل مصنف نے تازگی بخش شاعرانہ انداز بیان میں قلمبند کی ہے۔ مصنف نے غالب کے اشعار سے چند در چند مثالیں پیش کی ہیں اور مرہٹی میں ترجمے کے ذریعہ ان کے معانی کی نزاکت اور باریکیوں کو نمایاں کیا ہے انھوں نے کہا کہ غالب کو ان کی ناکام و مصائب زندگی اصبر آزما حوادث سے بہادرانہ نبرد آزمائی، انسان دوستی، وسیع المشربی، فیاضی دلی اور اپنے ہر ملنے والے سے مخلصانہ محبت نے ہی شاعر اعظم بنایا ہے اپنے حقیقی تجربات کے پیش نظر صوفیانہ طریق زندگی کے زیر اثر وہ اس روحانی وحدت الوجود کے قائل تھے جو برہمنوں کے ہندوانہ عقیدے سے قریب تر ہے۔

پونہ کے مشہور ادیب اور تنقید نگار پروفیسر ایس۔ کے۔ شرا ساگر نے غالب اور عام اردو شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے شری ودیا دھر گوکھلے کی اس گراں مایہ تصنیف کی بڑی تعریف کی۔ آپ نے فرمایا کہ مہاراشٹر کے باشندوں کو اب سے بہت پہلے اردو شاعری سے واقفیت بہم پہنچا لینا چاہئے تھی کیونکہ اردو شاعری کے مطالعہ سے مرہٹی شاعری کو یقیناً ہیئت اور موضوع کے گوناگوں اقسام سے بڑی مدد ملتی۔

آخر میں شری گجکھلے نے اُن واقعات کا تذکرہ کیا جن کے تحت ان کو غالب پر اس کتاب کے لکھنے کے لئے آمادہ ہونا پڑا۔ آپ نے کہا میں غالب یادگار کمیٹی کے معزز صدر جناب ڈاکٹر رفیق ذکریا اور اس کے سکریٹری سید شہاب الدین دسنوی کی فرمائش کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان کی حوصلہ افزائی اور پر خلوص تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ شری سیتو مادھو راؤ پگڑی نے بھی میری بڑی مدد کی مجھ کو محنت سے کام کرنے کا مشورہ دیا اور غالب اور دوسرے معاصر اردو شعرا کی کتابیں مطالعہ کے لئے فراہم کیں۔ ان اسباب کی فراہمی کی ہی وجہ ہے کہ میں استادانہ اور ماہرانہ انداز میں اس کتاب کو لکھنے کے قابل ہو سکا۔ میں ان کا بھی انتہائی ممنون احسان ہوں۔"

آخر میں موصوف نے اپنے دوست جناب شری پدیوشی کا بھی شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے پروف ریڈنگ کی زحمت گوارا کی۔ یہ تقریب دیدک سم شودھن منڈل گل ٹیکاڈی میں منعقد کی گئی تھی۔ اگرچہ یہ مقام شہر سے خاصہ دور ہے پھر بھی حاضرین کا کافی بڑا اجتماع ہو گیا تھا۔ مٹھائی کی تقسیم کے بعد تقریب کا اختتام ہوا۔

مرزا جعفر علی اثر مرحوم کو علمائے قوم کو خراج عقیدت

لکھنؤ:۔ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے ایک نمائندہ اجتماع میں آج یہاں مرزا جعفر علی اثر (مرحوم) کو ان کی ادبی خدمات شاعری اور تصانیف پر زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ یہ تقریب جو اقبال مینشن میں ہوئی اس کے خصوصی مہمان ہندوستان کے وزیر غذا اور زراعت جناب فخر الدین علی احمد تھے جنھوں نے یوم اثر کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ میں اثر صاحب سے ان کی تصانیف ہی کے ذریعہ واقف تھا لیکن ان کی تصانیف میں مجھے ان کی عظیم شخصیت کی پوری جھلک ملی۔

انھوں نے کہا کہ میں اثر صاحب سے ذاتی طور پر واقف نہ تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اثر صاحب اپنی زندگی میں بحیثیت شاعر اور ملک دوست زیادہ کامیاب رہے یہی سبب تھا کہ آزادی سے قبل انگریزوں نے بھی ان کو خطابات سے نوازا اور بعد کو قومی حکومت نے بھی ان کی تصانیف پر انھیں پدم بھوشن کا خطاب عطا کیا۔

جناب فخر الدین علی احمد نے اثر کمیٹی کو بھی مبارکباد دی کہ جس نے اس جلسے کا انتظام کیا اور اپنے پورے تعاون کا بھی اظہار کیا۔

بیگم حامدہ حبیب اللہ (ریاستی وزیر برائے سماجی بہبود) نے اپنی استقبالیہ تقریر میں اثر صاحب کے کارناموں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اثر صاحب نہ صرف ایک کامیاب شاعر، ادیب، نقاد اور مترجم تھے بلکہ ایک کامیاب آئی سی ایس افسر اور وزیر بھی تھے وہ اپنی زندگی میں ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر بھی رہے ان کے منظوم ترجمے "نغمۂ جاوید" کو ہندی میں شائع کرانے کے سلسلے میں حکومت سے جو امداد ممکن ہو سکتی ہے اسے دلانے کا بھی انھوں نے وعدہ کیا۔

اتر پردیش کے سابق وزیر انصاف سید علی ظہیر صاحب نے اثر صاحب سے اپنے پرانے تعلقات کا ذکر کیا۔ مرزا مہذب لکھنوی نے اثر صاحب کو ایک منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

صدر جلسہ کے علاوہ جناب علی جواد زیدی اور ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے بھی اثر صاحب کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

اثر صاحب کے داماد جناب علی ارشاد نقوی لکچرر شیعہ کالج نے اثر صاحب کی کتابوں کا ایک مکمل سیٹ جناب فخر الدین علی احمد کو پیش کیا۔ جلسہ کے کنوینر جناب کاظم علی خاں نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اثر صاحب کی تصنیفات میں "اثرستان" "بہاراں" مطبوعہ دیوانوں کے علاوہ رنگ بست (لالہ و گل)، ہلاک فریب، نغمہ جاوید، مزامیر جہاں بین، مطالعہ غالب، فرہنگ اثر وغیرہ ہیں۔ نظموں تنقیدی مضامین رباعیات اور غیر ملکی زبانوں کے ترجموں کے علاوہ بہت سا غیر مطبوعہ کلام اور خطوط موجود ہیں۔

○ الجمعیۃ دہلی

جمشید پور میں ایک ادبی نشست

اردو سرکل (جمشید پور) کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست حیدر عمر شاداں کی قیام گاہ پر منعقد ہوئی جلسہ کی صدارت پرکاش فکری نے کی سب سے پہلے منظر کاظمی نے "کہانی نمبر ایک" "کہانی نمبر دو" اور "ایک کجلائی ہوئی شام" کے عنوان سے تین افسانے پڑھے رانچی سے آئے ہوئے مہمان شاعر صدیق مجیبی نے تیسری کہانی کو سن کر کہا کہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ افسانے انفرادی سطح پر جو سیاسی اور نظریاتی

تصادم ہوتے رہتے ہیں ان کا شعور منظر کاظمی کے یہاں موجود ہے۔ سید احمد شمیم نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ منظر کاظمی نے عرصہ کی مشق کے بعد ایک مخصوص اسٹائل پیدا کر لیا ہے لیکن مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ یہ اسٹائل ان کا ساتھ کب تک دے سکے گا۔ ویسے ایک بات تو ماننی پڑتی ہے کہ نئی نسل کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں جلد ہی وہ ایک اچھا مقام بنالیں گے

آخر میں صدر جلسہ پرکاش فکری نے کہا کہ عصری مزاج کی نمائندگی کے لئے جس شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ منظر کاظمی کے یہاں موجود ہے

آخر میں حاضرین کی فرمائش پر منظر کاظمی نے اپنی کہانیوں پر اظہار خیال کیا کہ میں دو کہانیوں میں میں نے زمانۂ قدیم کے تاثرات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری کہانی "ایک جھلائی ہوئی شام" میں جو کچھ بھی ہے آج کے انسان کی اپنی صورت ہے۔ میں نے اس کہانی میں فرد کے وجود کو برقرار رکھنے والی انسانی جد و جہد کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے دور میں متعدد و ممتاز و نامور شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

• حیدر عمر شادان

تمل ناڈ میں اردو مجلس کا اجلاس

تمل ناڈ اردو مجلس کی مجلس عام کا اجلاس ۱۳ر جون ۱۹۷۱ء اتوار کی صبح کے دس بجے حضرت منظر دی کی درگاہ شریف کے احاطہ میں زیر صدارت ایڈوکیٹ جناب محمد قاسم صاحب منعقد ہوا۔ سال رواں کے لئے مندرجہ ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱) صدر :- جناب فضل الرحمن خاں صاحب۔

(۲) نائبین صدر :- " پروفیسر عبدالرشید صاحب ایم ایس سی

" عبدالکریم صاحب

" مجنو میاں صاحب

(۳) معتمد عمومی :- " حسرت سہروردی

(۴) نائبین معتمد :- " محمد ظفر اللہ صاحب

" کمال الدین صاحب بی ایس سی

" حسین شریف صاحب انور

(۵) خازن :- " لفٹننٹ بدر عالم صاحب بی۔ اے بی ایڈ

ان حضرات کے علاوہ اکیس احباب پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب ایم۔ بی۔ بی ایس نے شرکت کی۔ موصوف کو پیٹرن منتخب کیا گیا۔ چائے نوشی کے بعد حسرت سہروردی کے ہدیہ تشکر پر جلسہ ایک بجے اختتام پذیر ہوا۔

یوم اقبال

بنگلور ۱۶ر جون کی شام ۵ بجے طلبائے دار العلوم سبیل الرشاد کی ادبی انجمن جمعیۃ الارشاد کے زیر اہتمام مولانا ابوالسعود احمد صاحب (مہتمم) کی صدارت میں "یوم اقبال" منایا گیا۔ حکیم عبدالمنتقم خاں دانش بنگلوری نے اقبال کے مختلف واقعات اور اشعار کی روشنی میں فلسفۂ اقبال کو پیش کیا۔ مفتی اشرف علی صاحب نے بھی خطاب فرمایا۔

اس ادبی نشست میں جن حضرات نے خاص طور پر حصہ لیا ان میں حضرت کمال دیلوری، حضرت شوق بنگلوری، شاد زیبائی، عزیز بنگلوری، نیر ربانی، اشرف مسعودی، انجم بلیہوری اور منظر بنگلوری قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر طلبہ کے جدید کتب خانہ کا افتتاح بھی عمل میں آیا۔ آخر میں ناظم جمعیۃ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور یہ ادبی نشست شب کے ½ ۹ بجے اختتام پذیر ہوئی۔

• صغیر احمد خاں ناظم

ادارۂ تجدید ادب بھوپال کا طرحی مشاعرہ

بھوپال ۱۲ر جون:- گذشتہ شب حاجی محمد موسیٰ صاحب کی رہائش گاہ پر ادارہ تجدید ادب بھوپال کا ۵۶ واں ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب مولوی سراج الدین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مصرعِ طرح یہ تھا:-

"زندگی کے دشمن ہے زندگی کے سہارے"

مشاعرے میں بہت سے شعراء نے شرکت فرمائی۔ مشاعرہ دس بجے شروع ہو کر ۱۲ بجے ختم ہوا۔

• محمد موسیٰ معتمد خصوصی

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

کھپت کا ہے۔ کسی سندھی ادیب کا اپنے قلم سے روزی حاصل کرنا مشکل ہی نہیں شاید ناممکن ہے۔ کسی ناول کی ایک ہزار جلدیں بکنا بھی آسان نہیں اور شعری مجموعوں کا بک جانا تو شاید ممکن ہی نہیں۔ پھر ایک سندھی ادیب کے لئے روح سے تن کا رشتہ برقرار رکھنے کی صورت کیا ہوگی؟ یہ سوال اپنی جگہ پر، لیکن یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر جگہ تخلیقی ادیبوں کو زندگی گزارنے کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ادب کی تخلیق وہ فرصت کے اوقات میں کرتے ہیں یا اپنے آرام کا وقت قربان کرتے ہیں۔ کثیر تعداد میں بکنے والی کتابوں کے مصنف ہر جگہ بہت کم تعداد میں ملتے ہیں، ہندوستان میں تو بہت ہی کم ہیں اور سندھی میں شاید ایک بھی نہ ہوگا۔ اس سے قطع نظر امریکہ کا ایک ایسا ادیب جس کا ناول ایک لاکھ کی تعداد میں چھپ کر بک جاتا ہے، ادیب نہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کی پسند کا غلام ہے۔ وہ تخلیقی فنکار نہیں بلکہ اپنے پسند کرنے والوں کی حماقتوں، ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں، تعصبات اور توہمات کی پیداوار ہے۔ ادب بہر حال ادب ہے خواہ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد پانچ سو یا پچاس ہی افراد تک محدود کیوں نہ ہو۔ گیتا کا مخاطب صرف ایک شخص تھا۔ شاہ لطیف نے خواب میں بھی ریڈیو کے ذریعہ اپنی مقبولیت یا اپنی تخلیقات کے سستے ایڈیشنوں کی کثیر تعداد میں اشاعت کے بارے میں نہ سوچا ہوگا۔ شاعر اس لئے شعر کہتا ہے کہ وہ شعر کہنے پر مجبور ہے۔ ہر تخلیقی فنکار پر اس کے اضطراب، اس کی روحانی کسک، اس کی خود رنگی اور الجھن کا جبر ہوتا ہے۔ یہی جبر اسے اظہار کی راہ پر لگاتا ہے۔ بڑے ادیب لازمی طور پر صرف بڑی علاقائی حیثیت رکھنے والی زبانوں ہی میں پیدا نہیں ہوتے۔ البیرونی خوارزم میں پیدا ہوا اور اس نے ایک ایسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا جو اس زمانے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اور یورپ میں کم ہی جانی جاتی تھی، لیکن اس نے اسی نادر دین زبان کو ایک انٹرنیشنل حیثیت عطا کر دی۔ گورونانک نے پنجابی کو عظمت بخشی۔ اسی لئے مفکر، فنکار یا تخلیقی ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ خارجی حالات کی ناسازگاری سے برگشتہ خاطر نہ ہو یا بازار میں اپنی قیمت اور مانگ کی بنیاد پر خوش اور غمگین نہ ہو۔ اسے اپنی قوت اپنے ہی باطن سے حاصل کرنا چاہیئے اور اپنی ہی نظر کو اپنی زندگی اور فن کا راہبر بنانا چاہئے۔ اسے حالات پر حاوی ہونا چاہئے نہ کہ حالات اس پر حاوی ہو جائیں۔

اسے ایک اچھے ... کی عبارت کے لئے کسی پیغمبر کا ضرورت نہیں

(پی۔ ای۔ این جرنل سے ماخوذ)

باقی صفحہ ۶ سے آگے

میں اتنی مہارت بھی پیدا کرلی کہ اسے شعری اظہار کا ذریعہ بنانے پر قادر بھی ہو گئے۔ ان کا خلوص اور جد و جہد قابل قدر بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔

اس مجموعے میں نظمیں اور چند شخصی مرثیے شامل ہیں۔ سرور صاحب کا شعری مزاج آزادی اور سنجیدگی ہے چنانچہ ان کی تمام نظموں میں اُن اقدار اور افکار کی جھلک نمایاں ہے جنھیں وہ اپنی قومی دردمندی اور نیک نفسی کے باعث عزیز رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں اقبال سے استفادے کی کوشش بھی ملتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ سرور صاحب نے کئی نظموں میں اقبال کے منفرد آہنگ کو حتی الامکان کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اردو حلقوں میں ان کی یہ پیشکش مستحسن ہوگی۔ طباعت اور کتابت معمولی ہے۔ کتاب ایک روپیہ پچیس پیسے میں جناب ایس۔ ایم۔ سرور، پوسٹ آفس منڈو پار رضا، ملاپرم (کیرالا) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

▲

تبصرے

ڈاکٹر شمیم حنفی

کتاب : لامکاں (مجموعۂ کلام)
مصنف : غلام مرتضیٰ راہی
ناشر : نصرت پبلیشرز ۱۵ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳
قیمت : تین روپے

ادھر چند برسوں میں پابندی کے ساتھ ادبی رسائل میں شائع ہونے والے شعرا میں جن سے ادبی حلقے اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں، غلام مرتضیٰ راہی کا نام بھی شامل ہے۔ لامکاں ان کا پہلا مجموعہ ہے۔

بیشتر نئے شعرا کے سلسلے میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ان کے فکری تجربے ہی ایک دوسرے سے مماثل نہیں ہوتے بلکہ اظہار کی ہیئتیں بھی یکساں ہوتی ہیں۔ شاید یہ غزل کی صنف کا جبر بھی ہے جو بہت جلد نئی ترکیبوں، اصطلاحات اور پیکروں کو بھی معمولات کے دائرے میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کا ایک اور سبب نئی شاعری کے پس منظر میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شعرا نے بعض حسی اور فکری مسائل کے اظہار کو نئی شاعری کے لئے اساس سمجھ لیا ہے۔ تنہائی، مستقبل کا خوف، گھر اور معاشرے کے بکھرنے کا احساس، سائنسی تہذیب کی سرد مہری اور مشینی کلچر کی بے روح یک رنگی وغیرہ وغیرہ یقیناً ہمارے عہد کے مسائل ہیں اور ظاہر ہے کہ بیسویں صدی کے کسی شاعر کے کمرے میں انیسویں صدی کا کیلنڈر تلاش کرنا معکوس سمت کی دلیل ہے۔ زندگی کے بہت سے پہلو ایک جیسے ہیں تو حالات کے ردعمل میں بھی کسی قدر یکسانیت کا ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن شاعری صرف بیان واقعہ نہیں کیونکہ یہ کام اخباروں سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں ضرورت ہے اجتماعی تجربوں یا عام تہذیبی مسائل کو بھی اپنے ذاتی اور انفرادی رد عمل سے آمیز کرنے کی اور اپنے تخلیقی عمل کے آزاد سفر میں اظہار اور ہیئت کی نئی سمتوں تک پہنچنے کی۔ مسائل اور موضوعات سے تعارف کے ہزاروں وسیلے ہیں لیکن سچی تخلیقی استعداد اپنے ہی باطن کی قوت اور شعور کی برکت اور بصیرت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ دولتِ ہنر کمیاب ہے۔ لیکن نئے شعرا کو اس پر شرمانے یا اپنی ذات سے عقیدت کی بنا پر اس حقیقت کو جھٹلانے کے بجائے اپنا محاسبہ کرنا اور اپنے تخلیقی سفر کو نئے راستوں پر لگانا چاہئے۔

لامکاں کی غزلوں میں بھی عام طور پر ان تہذیبی مسائل، تجربوں اور افکار کی بازگشت ملتی ہے جو ہمارے عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی ہر زندہ زبان کے ادب کا مزاج بن چکے ہیں۔ راہی صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صاف ستھرے اور منظم طریقے سے ان تجربات کے اظہار کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کے رموز سے وہ ناواقف بھی نہیں، ان پر قادر بھی ہیں چنانچہ لامکاں کی غزلوں میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا بیساختہ لہجہ اور رنگیلا پن اچھی غزل کا مذاق رکھنے والوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تمام گرد و غبار دل سے نکل چکا تھا
برس چکا ابر اشک کھل کر تو میں نے دیکھا

ہمہ تن گوش تھے در و دیوار
چپ ہی رہنا ہمارا بہتر تھا

کھلی ہیں اب مری آنکھیں تو محو حیرت ہوں
کچھ اور ہی پس منظر دکھائی دیتا ہے

تری خوشی ہے تو لا کاسۂ گدائی دے
عجب نہیں ترے در تک ہی رسائی دے

آگ جو دل میں لگی ہے وہ بجھانے دے مجھے
آنچ آتی ہے سمندر پہ تو برداشت کر

ان اشعار میں نئی غزل کے بعض نمائندہ شعرا کی واضح پرچھائیں کے باوجود لہجے کی بے ساختگی اور زبان کی صفائی متاثر کرتی ہے ہر چراغ کہیں نہ کہیں سے روشنی مستعار لیتا ہے۔ اس کی منزل کمال یہ ہوگی کہ ایک بار اچھی طرح روشن ہونے کے بعد وہ اپنی روشنی میں برابر اضافہ کرتا جائے۔ لامکاں کے کئی اشعار سے یہ توقع کی جا سکتی ہے۔

کتابت، طباعت، گٹ اپ، سرورق اوسط۔

کتاب : ارمغان کیرالا (مجموعۂ کلام)
مصنف : ایس۔ ایم۔ سرور

سرور صاحب کی مادری زبان ملیالم ہے۔ لیکن اردو ان کا عشق ہے۔ اس مختصر مجموعے کے ابتدائی صفحات میں انھوں نے اپنے جو سوانحی حالات قلمبند کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے حالات کی دشواریوں کے باوجود کس محنت، خلوص، لگن اور پیاس کے ساتھ اردو زبان و ادب کا علم حاصل کیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے صرف اکتساب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی جد و جہد اور صلاحیتوں سے جلد ہی اردو زبان

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا
REGD-NO-L. 922 فون نمبر ۲۹ R-NO- 2186,57